مولانا احتشام الحق تھانوی رح

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی سے پہلی ملاقات پشاور میں ہوئی۔ آج سے تقریباً بائیس سال پہلے وہ اور میں دونوں ادارہ تبلیغ اسلام پشاور کی دعوت پر ربیع الاول کے اجتماعات سے خطاب کرنے کے لئے یکجا ہوئے تھے۔ قیام بھی ہم دونوں کا ایک ہی جگہ تھا۔ پشاور میں مشہور سماجی رہنما اور صنعت کار سید ظفر علی شاہ ہمارے میزبان تھے۔ ان دنوں ہمارے اور مولانا کے نظریات میں کوئی خاص ہم آہنگی نہیں پائی جاتی تھی مگر یہ دو تین دن کا ساتھ بڑے مزے کا تھا۔ شعر و شاعری 'لطیفے' چٹکلے سیاسی و دینی مباحث پر موضوع چھڑا اور ہر میدان میں مولانا کی خداداد ذہانت اور حاضر جوابی کا قائل ہونا پڑا۔ لین دین' پڑوس' سفر میں یکجائی یہ تین پیمانے ایسے ہیں کہ کسی انسان کی حقیقی شخصیت انہی سے ماپی جا سکتی ہے۔ لین دین کی تو مولانا سے کبھی نوبت نہ آئی لیکن سیرت کے جلسوں اور کانفرنسوں وغیرہ میں پشاور سے لے کر راولپنڈی اور راولپنڈی سے لے کر بہاولپور اور کوئٹہ تک مولانا کے ساتھ کئی کئی دن سفر میں اکٹھے گزرے اِس لئے پڑوس اور سفر کے معیار سے مولانا کو جانچنا اور پرکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اب یاد کرتا ہوں تو ان کی پابندئ اوقات' آداب مجلس کا لحاظ 'نشست و برخاست کا خیال' کیا کیا پہلو سامنے نہیں آتا۔ لباس میں تو ان کی اپنی ایک مخصوص وضع تھی ساری عمر سفید پوشاک پہنی اس پر سفید واسکٹ اور سفید ہی دوپلی ٹوپی ہاتھ میں عصا' پاؤں میں دیسی جوتا اس پر سفید ڈاڑھی' خوشبو لگانے کا التزام جب بھی دیکھا جائے لباس پر نہ کوئی داغ نظر آئے نہ کوئی شکن۔ خوش وضع اور خوش لباس لوگ بہت سے دیکھے لیکن حضرت مولانا کی سی سج دھج کسی میں کم ہی نظر آئی۔ خطابت میں بھی مولانا کا اسلوب بڑا منفرد اور جداگانہ تھا۔ قرآن حکیم پڑھنا شروع کرتے تو جی چاہتا کہ بس پڑھتے ہی چلے جائیں۔ کانوں میں رس گھلنے لگتا اور پتھر دل بھی پانی پانی ہو

جاتے۔ کبھی کبھی دوران تقریر کوئی شعر پڑھتے تو اس پُرسوز ترنم سے کہ سامعین جھوم جھوم جاتے۔ اصلاً واعظ تھے اس لئے تقریر میں بھی وعظ کا سا پھیلاؤ ہوتا۔ بات سے بات پیدا کرتے چلے جاتے۔قصّے کہانیاں اور حکائیتیں بھی سناتے اور مثنوی کے اشعار سے بھی دلوں کو گرماتے۔ اہل زبان تھے زبان بھی بہت خوبصورت استعمال کرتے۔ دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے کی تقریریں تو ان کا روز مرّہ کا معمول تھا ممکن نہ تھا کہ وہ بول رہے ہوں اور لوگ طوالت سے اُکتا کر اٹھنے لگ جائیں۔ ان کے مواعظ میں لوگ یوں ساکت و صامت ہوتے جیسے ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔ یوں تو مولانا دین کے سلسلے میں جملہ ہی معاملات میں شمشیر برہنہ تھے ارباب حکومت سے تعلقات بھی ہوتے تو ان کی کسی مخالف اسلام حرکت پر خاموش نہ رہتے کھل کر کلمہ حق کہتے مگر رویتِ ہلال کے مسئلہ میں وہ بطور خاص بڑے حسّاس تھے۔ ان کے نزدیک یہ صرف چاند نظر آنے یا نہ آنے کا سوال نہ تھا اسلامی عبادات کی صحت ادائیگی کا بھی!اس پر بڑی حد تک انحصار تھا اس کے لئے جیل بھی کاٹی۔ واقعہ یہ ہے کہ رمضان اور عیدین کے چاند کے سلسلے میں ان کا نام اس حد تک بریکیٹ ہو گیا تھا کہ لوگ جب تک ان کا اعلان نہ سن لیتے تھے کسی بیان پر یقین ہی نہ کرتے۔ میں نے قومی اسمبلی میں رویتِ ہلال کا بل منظور کرایا تو کمیٹی کے پہلے چیئرمین حضرت مولانا ہی منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنے فرائض اس دّقت نظر اور خوش اسلوبی سے ادا کئے کہ ملک سے سالہا سال کا یہ تفرقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے زمانۂ اقتدار میں میرے ہم سفر کیمونسٹ رفیقوں نے مجھے نشانہ تنقید و تنقیص بنایا تو مولانا نے باقاعدہ اخباری بیان کے ذریعے ان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس پر زرد صحافت کے بعض علمبرداروں نے ان پر کیا کیا کیچڑ نہ اچھالا لیکن وہ کوہ استقامت بن کر ڈٹے رہے۔ مارشل لاء کے زمانے میں میری سفرحج سے واپسی پر کراچی کے بیچ لگژری ہوٹل میں دعوت استقبالیہ ہوئی تو مولانا نے ازراہِ [illegible] دنوازی خود ہی سپاسنامہ پڑھا شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کے اور ہمارے تعلقات کرسی کی وجہ سے نہیں الحبّ ﷲ والبغض ﷲ کی بنیاد پر قائم تھے۔ سیرت النبیؐ کا بیان ان کا دل پسند موضوع اور ایک لحاظ سے ان کی زندگی کا مشن تھا۔ دل کے مریض تھے مدراس (بھارت) سے سیرت کے جلسوں کے لئے دعوت نامہ آیا تو اپنے معالج کی مخالفت کے باوجود سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات دن ذکر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر وعظ کئے۔ اپنی آخری تقریروں میں کہا بھی کہ ایسا لگتا ہے کہ اہل مدراس میرے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر دم لیں گے مگر نہ لوگ تھکنے میں آئے اور نہ مولانا ہی باز آئے یہاں تک کہ ذکر حبیبؐ کرتے کرتے ہی جان جان آفریں کو سونپ دی۔ ؎

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے